مقالات

سیرتِ محمدی کا پیغام بیسویں صدی کے نام

از مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی

(یہ مقالہ مولانا نے گذشتہ ماہ مارچ میں سیرت کمیٹی پشاور کے جلسۂ سیرت کیلئے لکھا گیا)

حضرات! جب ہمارے سامنے جاہلیت کا نام لیا جاتا ہے تو بے اختیار ہماری آنکھوں کے سامنے چھٹی صدی مسیحی کا وہ تاریک زمانہ تصویر کی طرح پھر جاتا ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور جس میں آپ کی ہدایت اور تعلیم کا سب سے پہلا اور سب سے نمایاں معجزہ ظاہر ہوا۔ جاہلیت کا لفظ سنتے ہی دفعتہ عرب کی قوم اپنی ان تمام جاہلی خصوصیات و اخلاق کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آتی ہے جن کا مرقع ہمارے سیرت نگاروں نے پیش کیا ہے۔

لیکن حضرات جاہلیت اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ عہد زمانہ جاہلیت ہے، جو وحی و نبوت کی رہنمائی سے محروم ہو اور انبیا علیہم السلام کی روشنی وہاں تک پہنچی ہی نہ ہو، یا پہنچی ہو لیکن اس نے اپنی آنکھیں اس کی طرف سے بند کر لی ہوں، خواہ وہ چھٹی صدی عیسوی کی عالمگیر جاہلیت ہو، یا یورپ کی تاریخ کی وہ تاریک متوسط صدیاں جو عموماً قرون مظلمہ (Dark Ages) کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، یا بیسویں صدی کا وہ روشن و تابناک عہد تہذیب و ترقی جس سے ہم گذر رہے ہیں۔

قرآن مجید ہم کو بتلاتا ہے کہ دنیا میں روشنی صرف ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی ایک ہی ہے، اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، البتہ تاریکیاں بے شمار ہیں ان کا حد و حساب نہیں۔ اگر خدا کی روشنی کا (جو صرف انبیاء کے ذریعہ آتی ہے) اجالا نہ ہو تو پھر دنیا کی ظلمتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں، زندگی کی ہر منزل اور اس کے ہر موڑ پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے

كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ	جیسے گہرے دریا میں اندھیرے، چڑھی آتی ہے اس پر
مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ	ایک لہر، اس پر ایک اور لہر، اس کے اوپر بادل، اندھیرے ہیں
بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ	ایک پر ایک، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے خود نہ دیکھنے پائے، اور جس کو
يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (نور - ۵)	اللہ نے روشنی نہیں دی اس کے واسطے کہیں روشنی نہیں۔

قرآن میں جہاں کہیں نور اور ظلمت کا ساتھ تذکرہ آیا ہے نور کو صیغۂ واحد کے ساتھ اور ظلمت کو جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلمتیں متعدد ہو سکتی ہیں لیکن نور ایک ہی ہو گا۔ اس قدرتی روشنی کی اگر چمک نہ ہو تو پھر کسی مصنوعی روشنی سے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اجالا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ روشن اور جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع اور تاریک قبر ہے جس میں روشنی کا کوئی منفذ

نہیں، اور جہاں "شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا۔"

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا۔ (انعام۔ ۱۵)

بھلا وہ جو مردہ تھا، ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو روشنی دی کہ اس کے سہارے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس کے برابر کہیں وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیروں میں پڑا ہوا ہے وہاں سے نکل نہیں سکتا۔

حضرات! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی سرزمین تک (جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں بلکہ ڈوبتا ہے) نبوت کی روشنی بہت کم پہنچ پائی۔ یہاں اس آسمانی روشنی کی خانہ پُری ہمیشہ انسانی روشنی سے کرنے کی کوشش کی گئی۔ یونان اور روما کا عہد زریں انسانی علوم وفنون کی ترقی کے لحاظ سے بلاشبہ تاریخ کا درخشاں عہد ہے لیکن نبوت کی تعلیمات وہدایت کے لحاظ سے اتنا ہی بے نور ہے جتنا تاریک سے تاریک دورِ جہالت ہو سکتا ہے۔ یہاں خدا کی ذات وصفات کے بارے میں بلا کسی رہنمائی اور روشنی کے محض قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (ان کو اس کا ذرا بھی علم نہیں۔ وہ محض اٹکل اور قیاس سے کام لیتے ہیں)۔ الٰہیات وفلسفہ کا وہ طلسم جو ان ملکوں کے حکما وفلاسفہ نے ترتیب دیا ہے اپنی خیال آرائی اور اعجوبہ زائی کے لحاظ سے مشرق کے طلسم ہوش رُبا اور فسانۂ عجائب سے کم نہیں۔ سقراط وافلاطون (نہ کہ ارسطو) کے اقوال اور رواقی فلاسفہ کی اخلاقی تعلیمات میں انبیاء کی تعلیمات کے اثرات کی جھلک کہیں کہیں ضرور اس طرح آجاتی ہے جیسے برسات کی اندھیری رات میں کرمکِ شب تاب کی چمک جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انبیا کی کچھ باتیں ان کے کان میں بھی پڑی تھیں، لیکن یہ روشنی اتنی تیز اور دیرپا نہیں کہ اس کے سہارے وہ اپنا سفر طے کر لیں۔ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (جب بجلی چمکتی ہے تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں)۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح کا چراغ ہدایت مشرق میں تو دو صدی تک بادِ مخالف کے سخت جھونکوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن مغرب میں بت پرستوں کے دامن تلے بجھ کر رہ گیا۔ حضرت مسیح کی تعلیمات نے وہاں جا کر اپنی صلیت کھو دی جہاں مسیحیت کو پہلی مرتبہ طاقت وحکومت حاصل ہوئی، شرک وبت پرستی کا دھارا مسیحیت کے بیچ دریا میں بہنے لگا۔ شاید ہی دنیا کے کسی مذہب کے لیے کوئی نو مذہب اتنا ہی آفت ثابت ہوا ہو جتنا مسیحیت کے لیے شہنشاہ قسطنطین اور سینٹ پال۔ مسیحیت کے اس الہامی چراغ کے گُل ہو جانے کے بعد اربابِ کلیسا نے مذہبی مجلسیں سجا کر ان میں کافوری شمعیں جلا جلا کر صدیوں خوش اعتقاد مسیحی دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ حضرت مسیح کی لائی ہوئی روشنی ان کے پاس موجود ہے، لیکن یہ روشنی درحقیقت صدیوں پہلے تاریکیوں میں گم ہو چکی تھی۔ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ (اس کی طرح جس نے آگ روشن کی جب آگ سے اس کا گرد وپیش روشن ہو گیا تو اللہ نے ان کی روشنی اٹھا لی اور ان کو تاریکیوں میں اس طرح چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ نظر نہیں آتا)۔

اس سب کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف واجب ہے کہ مسیحیت ہی کی بدولت مغرب میں خدا کا اعتقاد اور آخرت کا خیال پایا جاتا تھا حقیقت میں جو سماجی مذہب نتیجۃً ہی بدل جائے، خدا اور آخرت کا خیال اس کے رگ وریشہ میں اس طرح ساری ہوتا ہے کہ کبھی اس سے نکل

نہیں سکتا۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں یورپ میں عقلیت گردر اصل مادہ پرستی اور متاع پرستی کی، جو تحریک پیدا ہوئی، اس نے مغرب کو کھلے طریقہ پر مادہ پرستی کے راستہ پر لگا دیا۔ رفتہ رفتہ یورپ ایسا مادہ پرست ہو گیا کہ اس کی زندگی اور اس کے ذہنی نظام میں خدا اور آخرت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ سارے یورپ نے اپنی زبان سے خدا اور آخرت کا انکار بالاعلان تو نہیں کیا، لیکن اس کی زندگی اس طرح کی ڈھل گئی ہے کہ گویا نہ خدا ہے، نہ آخرت۔ آج یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یورپ کا مذہب مسیحیت نہیں بلکہ مادیت ہے۔ یورپ عرصۂ دراز تک بت پرست رہا ہے اور عرصۂ دراز سے مسیحیت کا مدعی ہے، لیکن اس اخلاص اور جوش کے ساتھ اس نے نہ کبھی بت پرستی کی اور نہ مسیحیت کی پیروی کی، جیسی کہ آج مادیت کے اس مذہب کی کر رہا ہے۔ اس نئے مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں (کارخانے، صنعتی و تجارتی مراکز اور تفریح گاہیں) شب و روز معمور ہیں۔ اس مذہب کے پروہت (ملک التجار، سرمایہ دار، صناع)، بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں بلکہ ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس کے بالمقابل عیسائیت مغرب میں سایہ بن کر رہ گئی ہے۔ لوگوں کے رجحان کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے ہو گا، پروفیسر جوڈ اپنی تالیف (A Guide to modern wickedness) میں لکھتا ہے

> "میں نے بیس طلبہ اور طالبات کی، جو سب بیس سے کچھ اوپر عمر کے تھے، ایک جماعت سے سوال کیا کہ ان میں سے کتنے کسی معنی میں بھی عیسائی ہیں۔ صرف تین نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا، عیسائی ہونے کا اقرار کیا۔ سات نے کہا کہ انھوں نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا۔ باقی دس نے صاف صاف کہا کہ وہ کھلے طور پر مسیحیت کے خلاف ہیں۔
>
> میرا خیال ہے کہ مسیحیت کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کا یہ تناسب اس ملک میں کوئی استثنائی اور غیر معمولی مثال نہیں" (ص ۵۴)

اس مادہ پرستی کا ایک شعبہ اور مظہر زر پرستی ہے جو مغرب میں عروج پر ہے۔ یہی مصنف اپنی دوسری تصنیف (Philo[illegible]phy for our times) میں لکھتا ہے

> "جو نظریۂ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ ہے، جو ہر مسئلہ اور معاملہ کو پیٹ اور جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھتا اور جانچتا ہے۔"

مغرب میں اس خدا فراموشی کے وہ سب نتائج ظاہر ہوئے اور ہو رہے ہیں، جو اس ذہنیت و سیرت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ایک نتیجہ یہ ہے کہ مغربی انسان نے ایک خدا کا دامن چھوڑ کر دوسرے سینکڑوں خداؤں کا دامن پکڑ لیا ہے، ایک حقیقی آستانہ سے سر اٹھا کر، جہاں سر جھکانے کے بعد وہ تمام آستانوں سے بے نیاز ہو سکتا تھا، ہر سنگ آستاں پر وہ اپنی پیشانی رگڑ رہا ہے۔ ایک خدا کو چھوڑ دینے کی سزا خدا کی طرف سے ہمیشہ یہی ملی ہے۔ یہ ارباب من دون اللہ بڑی تعداد میں مغرب پر مسلط ہیں اور ساری مغربی دنیا ان کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہے۔ یہ کہیں سیاسی سردار ہیں، کہیں اقتصادی دیوتا، کہیں اپنے تراشے ہوئے معیار زندگی، کہیں خود تجویز کیے ہوئے فرائض و لوازم زندگی، جنھوں نے اپنے پرستاروں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے اور اپنی اتنی بندگی کرا رہے ہیں جس کے سامنے خدا کی بندگی کی ہزار بار قدر آنی چاہیے۔ ایسی مشقت لے رہے ہیں جو بے زبان جانوروں اور بے جان مشینوں سے نہیں لی جاتی؛ ایسی قربانیاں کرا رہے ہیں جو آج تک کسی دیوتا کے نام پر نہیں کی گئیں۔ ان ارباب متفرقون کے مقاصد و خواہشات میں سخت تصادم د

کشمکش ہے۔ ان کے ان متضاد مقاصد کی خاطر سارا عالم زیروزبر ہو رہا ہے۔ ان تمام بتوں میں خاک وطن کا بھی ایک بڑا بُت ہے جو ہمیشہ خون کی نذر اور انسانی جانوں کی بھینٹ چاہتا رہتا ہے۔ انھیں میں ایک بُت پیٹ ہے جس کی بندگی میں بیسویں صدی کا انسان رات دن لگا رہتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے راضی نہیں۔ کچھ مدت ہوئی سر آلیور لاج نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا

"زندگی کی سادگی اب خواب وخیال ہو گئی۔ اب نہ کوئی مقصد سامنے ہے نہ اونچا تخیل، ہر شخص رات دن بیل کی طرح اپنے کارخانے یا دفتر کی غلامی میں لگا ہوا ہے۔ تیز رفتار سواریوں کی ایجاد کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر وقت ہر شخص کے پیر پر گویا سنیچر سوار رہتا ہے۔"

خدا فراموشی کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود فراموش ہو گیا ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی ہے، وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ (ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھول گئے تو خدا نے انھیں خود اپنے آپ سے بے خبر کر دیا)۔ بیسویں صدی کا انسان خود فراموشی کا مکمل نمونہ ہے۔ اس نے اپنی حقیقت، اپنا انسانی امتیاز، اپنا مقصد زندگی اور اپنی پیدائش کی غرض بالکل بھلا دی، اور بالکل بہیمانہ یا جماداتی طرز زندگی اختیار کر لیا ہے۔ وہ ایک ایسی روپیہ ڈھالنے والی مشین بن گیا ہے جو خود اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ حد یہ ہے کہ جسمانی راحت اور قلبی سکون واطمینان جو اس جدوجہد کی کسی معنی میں قیمت ہو سکتا ہے، نہ اس کو اپنی زندگی میں میسر ہے، اور نہ اس کو اس کا ہوش باقی رہا ہے۔ سابق الذکر مصنف (پروفیسر جوڈ) نے صحیح لکھا ہے

"جہاں تک ہمارے زمانے کی سوسائٹی کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ ہمارا اعتقاد ہے کہ تمدن نام ہے مسرت کا، مسرت زمانۂ موجودہ کے نوجوان کا دیوتا ہے، اس کے آستانے پر وہ سکون، راحت، امن اور دوسروں کے ساتھ مہربانی کو بڑی بے دردی کے ساتھ بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔"[۱]

اس عالم خود فراموشی اور مدہوشی میں انسان کا موضوع ہی بدل گیا ہے۔ اس نے انسانی دائرۂ ترقی کو چھوڑ کر ترقی کے غیر انسانی دائروں میں بڑی ترقی کر لی ہے لیکن کامل انسان کی حیثیت سے اس نے کوئی ترقی نہیں کی بلکہ روز بروز اس کے انسانی خواص میں تنزل ہو رہا ہے۔ موجودہ ترقیات کا تجزیہ کیجیے، کچھ درندوں کے کمالات نکلیں گے، کچھ پرندوں کے اور کچھ مچھلیوں کے۔ ایک مغربی مصنف نے اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو تفاوت ہے اس سے ہمارا ہر موڑ پر سابقہ پڑتا ہے۔ ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا حال یہ ہے کہ ہم بیٹھے بیٹھے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کر سکتے ہیں، سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے پھرتے ہیں، ریڈیو کے ذریعہ سیلون میں گھر بیٹھے لندن کے بڑے گھنٹے (Big Ben) کی آواز سنا کرتے ہیں، بچے ٹیلیفون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں، برقی تصویریں آنے لگیں، بے آواز کے ٹائپ رائٹر چل گئے، بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت بھرے جا سکتے ہیں، کھیتیاں بجلی سے پکائی جاتی ہیں، ربر کی سڑکیں بنتی ہیں، اکسرے کے ذریعہ ہم اپنے جسم کے اندر جھانک کر

[۱] A Guid to Modern Wickedness. P. 241

دیکھ سکتے ہیں، تصویریں بولتی اور گاتی ہیں، لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا ہے، برقی موجوں سے بالوں میں پیچ وخم پیدا کیا جاتا ہے، آبدوز کشتیاں قطب شمالی تک اور ہوائی جہاز قطب جنوبی تک پہنچ کر جاتے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود ہم سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام اور حفاظت سے ساتھ کھیلیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں اور نوے ہزار زخمی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے (Pendin Sands) پر تین سو یا چار سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا اور کسی ہوا باز نے ماسکو سے نیویارک کی مسافت، مجھے یاد نہیں، بیس گھنٹے میں یا پچاس گھنٹے میں طے کی تھی۔ جب میں کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا، ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں چڑیوں کی طرح اڑتے اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو لیکن ابھی تک تم کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آتا۔"[a]

اس عالم خود فراموشی میں مغرب کی خدا فراموشی کا شکوہ ہی فضول ہے۔ وہ تو اقبال کے اس شعر کا صحیح مخاطب ہے۔

زخود گریختئی، آشنا چہ می جوئی — بآدمی نرسیدی، خدا چہ می جوئی

اب مغرب کی آخرت فراموشی کو لیجیے۔ انکارِ آخرت کا پہلا اور طبعی اثر یہ ہے کہ دنیاوی زندگی اور دنیا کی چیزوں سے لذت و تمتع کا ایک جنون اور بحران پیدا ہوگیا ہے۔ تمتع ہی مقصدِ حیات قرار پا گیا ہے۔ آج مغرب کے ہر گوشہ سے صدائے نائے و نوش اور نعرہ "عیش کوش" بلند ہو رہا ہے اور اس کی ساری زندگی اس کے اور اس کے ذرائع کے حصول کی مسابقت میں صرف ہو رہی ہے۔ اس مسابقت نے زندگی کو ایک ایسا ریس کا میدان بنا دیا ہے جس کا کوئی منتہا نہیں۔ زندگی کی ایک نہ بجھنے والی پیاس اور ایک نہ مٹنے والی بھوک ہے۔ ہر شخص کی زبان پر ھل من مزید کی صدا ہے۔ زندگی کی ضروریات روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ نفس کے مطالبات کی تکمیل کا سامان اور اس میں تنوع قابو سے باہر ہوتا جارہا ہے اور اس نے صدہا اجتماعی و معاشی پیچیدگیاں اور مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ تاجرانہ رقابت اور مقابلہ نے اس میں اور امداد دی۔ معیارِ زندگی روز بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے، یہاں تک کہ ہر شخص جب نظر اٹھاتا ہے منزل اس کو دور اور بامِ مقصود اونچا نظر آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اس کے حصول کی تمنا اور کوشش میں بے کیف اور بے لطف ہو جاتی ہے اور وہ حرص وطمع کے ایک مسلسل عذاب اور زندگی کی لامتناہی جدوجہد میں مبتلا رہتا ہے۔ صبر و قناعت جو سکون و اطمینانِ قلب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، یورپ میں عرصہ سے ناپید ہے۔

حضرات! آپ تعجب نہ کریں، انکارِ آخرت یا آخرت کو فراموش کر دینے کے بعد لذت و تمتع کا یہ جذبہ جس کو ہم مسلمان دیوانگی سمجھتے ہیں منکرِ آخرت کے نقطۂ نظر سے عین فرزانگی ہے۔ جو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے تصور سے خالی ہو وہ اس زندگی میں لطف اٹھانے اور جگر کی آگ بجھانے میں کیوں کمی کرے، اور عیش و لطف کو کس دن کے لیے اٹھا رکھے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ — کافر لطف اندوز ہوتے ہیں اور کھاتے ہیں اس طرح جیسے جانور

a. AGuid to Modern Wickedness. P. 261.262-263.

الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد - ۱)

کھاتے ہیں اور جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔

دوسری جگہ کہتا ہے :-

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (حجر - ۱)

انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو، کھائیں، پئیں، عیش و آرام کریں اور امیدوں پر بھولے رہیں، وہ وقت دور نہیں کہ انھیں معلوم ہو جائے گا۔

انکار آخرت کا دوسرا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور اس کی چیزیں اور اس میں کام آنے والے اعمال زیادہ آراستہ، زیادہ معقول اور زیادہ مدلل نظر آتے ہیں۔ مادی ذہنیت اور سطحی نگاہ پیدا ہو جاتی ہے جو حقائق تک نہیں پہنچ سکتی۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ (نمل - ۱)

بے شک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے انکے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے ہیں، چنانچہ وہ بھٹک رہے ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا. الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا. أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (الکہف - ۱۲)

کہو ہم تمھیں خبر دیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھو گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کام بنا رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور اس کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہوئے پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور اس لیے قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن تسلیم نہ کریں گے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ زندگی میں حقیقت و سنجیدگی کا حصہ کم اور لہو و لعب کا زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کے ایک بڑے حصہ کو تفریحات اور سرور و نشاط کے اعمال و مشاغل گھیرے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے نازک وقتوں اور خطرات میں بھی ان کے اس تفریحی انہماک اور لطف اندوزی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا (الانعام - ۸)

چھوڑ دو ان کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنا رکھا ہے اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ حوادث و واقعات کے حقیقی اسباب و علل پر ان کی نظر نہیں جانے پاتی بلکہ چند ظاہری چیزوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ وہ معاملات کی گہرائی تک نہیں اتر سکتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہایت نازک وقت میں بھی ان کے تفریحی انہماک اور غفلت میں کمی نہیں ہوتی، واقعات کی کوئی تاویل کر لیتے ہیں اور ان کی کوئی فرضی اور غیر حقیقی وجہ تلاش کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں، اور ان کے رویہ میں کوئی انقلابی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں مادہ پرست و ظاہر بین قوموں کی نفسی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے :-

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ. فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُمْ

اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی امتوں پر رسول بھیجے تھے۔ پھر ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کیا تاکہ وہ ہمارے حضور گڑگڑائیں۔ تو کیوں نہ وہ گڑگڑائے جبکہ ہماری طرف سے ان پر سختی آئی؟ مگر ان کے دل

وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (الانعام - ۵)   تو اور سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کے کام ان کو آراستہ کرکے دکھائے۔

انکارِ آخرت کی ایک خاصیت تکبر ہے۔ منکرِ آخرت کو متکبر ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ جو اپنے سے کسی بالاتر طاقت اور اس زندگی کے بعد کسی زندگی اور روزِ جزا کا یقین نہیں رکھتا، اس کو ایک شترِ بے مہار اور ایک سرکش انسان بننے سے کیا چیز روک سکتی ہے؟ اس لیے قرآن مجید میں انکارِ آخرت کے ساتھ بکثرت تکبر کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں

وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ   اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل منکر اور وہ متکبر ہیں۔

فرعون اور اس کے لشکر کے متعلق کہا گیا:۔

فَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ۔   فرعون اور اس کے لشکروں نے حق کے مقابلہ میں تکبر و انکار سے کام لیا اور وہ سمجھے کہ وہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

ایسی منکرِ آخرت اور مادہ پرست قوموں کا پنجہ آہنی، ان کی گرفت ظالمانہ، اور ان کی فتح ایک آفت ہوتی ہے جو ملکوں اور شہروں کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ (الشعراء - ۷)   جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو زبردستوں اور ظالموں کی طرح ہاتھ ڈالتے ہو

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً   بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔

اسی طرح مغرب ایمان بالرسالۃ کی دولت سے بھی محروم رہا۔ حضرت مسیح کو اس نے ابن اللہ تک مان لیا مگر عملاً ان کو اپنی پوری زندگی کا رہنما اور امام مطاع تسلیم نہیں کیا۔ پہلی چیز صرف ایک نظری اور اعتقادی تھی، اس کے تسلیم کرنے سے زندگی اور اخلاق و اعمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بخلاف اس کے ان کو اپنی زندگی کا رہنما نے کامل، ان کی سیرت کو مشعل زندگی اور ان کو اپنے لیے اسوہ کامل ماننے سے زندگی کا رُخ بدل جاتا۔ لیکن مغرب نے ایسا نہیں کیا اور نہ ایسا کرنا آسانی سے ممکن تھا۔ حضرت مسیح کی زندگی کے صرف تین سال کے حالات اس کے پاس تھے اور وہ بھی ایسے کہ زندگی میں ان کی تقلید و اقتدا بہت مشکل تھی۔ اگر اہلِ مغرب حضرت مسیح کی سیرت و اقوال اور ان کی ہدایت و تعلیمات کو اپنی زندگی کا رہنما بنانا چاہتے تو ان کے لیے اس میں عملی دقتیں تھیں، مذہبِ مسیحی کے نمائندوں کے پاس ایسا کوئی مستند مذہبی سرمایہ نہ تھا جس کی مدد سے وہ ایک پوری قوم کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے، نہ وہ ایسی دینی حکمت و بصیرت رکھتے تھے جس سے وہ مغرب کی نوخیز قوموں کو دنیاوی ترقی کے ساتھ مذہب کے دائرے میں رکھ سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی قوموں نے اپنی عملی زندگی حضرت مسیح کی قیادت اور کلیسا کی نگرانی سے آزاد کر لی اور انھوں نے اس طرح کی زندگی گذارنی شروع کر دی گویا کہ وہ کسی پیغمبر کی امت نہیں ہیں۔ ان کے دماغوں اور دلوں پر حضرت مسیح کی معصومانہ تعلیمات کا گہرا اثر نہیں پڑ سکا۔ وہ اس اخلاقی تربیت اور تزکیہ سے محروم رہے جو پیغمبروں کے پیرو حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے وسائل بکثرت حاصل کیے لیکن خیر کا رجحان صرف پیغمبر کی تعلیمات کے اثر اور اس کی تربیت و اصلاح سے حاصل ہو سکتا ہے، مادی علوم و اکتشافات سے وہ نہ حاصل ہو سکتا تھا نہ ان کو حاصل ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سارے وسائل اور یہ تمام طاقتیں جو خیر کے رجحان کے ساتھ عالمِ انسانی کی

بہبودی کا سبب بن سکتی تھیں، زمین میں سربلندی اور فساد کا آلہ بن گئیں، اس لیے کہ ان کے استعمال کرنے والوں کے کان اس صدا سے ناآشنا ہیں :-

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (قصص - ۹)	وہ پچھلا گھر تو ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور فساد نہیں چاہتے اور انجام کار کی بھلائی تو اللہ سے ڈرنے والوں کا حصہ ہے۔

حضرات! اس خدا فراموشی، آخرت فراموشی، اور پیغمبروں کی تعلیمات سے استغنا و بے نیازی کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب آج اس قدر روشن ہے کہ اس کی رات بھی دن ہے لیکن اس قدر تاریک ہے کہ دن بھی رات ہے۔ روشنی اور ترقی کے اس دور میں آج وہ سب کچھ پیش آرہا ہے جو وحشت و بربریت کے دور کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ بقول میر اکبر حسین الٰہ آبادی مرحوم :

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں — اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

گذشتہ جنگ کے اختتام پر مسٹر لائڈ جارج نے کہا تھا :

"اگر حضرت مسیح اس دنیا میں تشریف لے آئیں، تو زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے۔ وہ ملاحظہ فرمائیں گے کہ دو ہزار برس کے بعد بھی، انسان فتنہ و فساد و کشت و خون، قتل و غارت میں بدستور مبتلا ہے، بلکہ اس وقت تو انسانیت کے جسم سے تاریخ کی عظیم ترین جنگ کے زخم سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں، اور زمین اس قدر تاراج ہو چکی ہے کہ نوبت فاقہ کشی کی آگئی ہے۔ اور حضرت آکر کیا دیکھیں گے؟ کیا اخوت و مساوات کے ساتھ لوگوں کو ہاتھ ملاتے؟ یا اس کے بالکل برعکس اس جنگِ عظیم سے بھی بڑھ کر خلک دیو زادوں جنگ کی تیاریاں کرتے؟ ایک سے بڑھ کر ایک جان لیوا اور ستم کش آلاتِ ہلاکت ایجاد کرتے اور تعذیب کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے[1]؟"

اور موجودہ جنگ کے آغاز پر مسٹر ایڈن نے فرمایا :

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس دنیا کے باشندے اس صدی کے پچھلے حصہ میں غاروں میں زندگی گزارنے والے دنیا کے قدیم وحشیوں کا طرزِ زندگی اختیار کر لیں گے اور اسی وحشت و بربریت کا دور شروع ہو جائے گا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں قائم تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ تمام ممالک ایک ایسے ہتھیار سے بچنے کے لیے کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں جس سے ہیں تو سب کے سب خائف مگر اس کو قابو میں رکھنے پر راضی نہیں ہوتے۔ میں بعض اوقات تعجب سے سوچتا ہوں کہ اگر کسی دوسرے سیارہ سے کوئی سیاح اور کر اس زمین پر آئے تو وہ ہماری اس دنیا کو دیکھ کر کیا کہے گا۔ وہ دیکھے گا کہ ہم سب اپنی ہی بربادی اور ہلاکت کے وسائل تیار کر رہے ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اس کے طریقِ استعمال کی اطلاع بھی دے رہے ہیں[2]۔"

حضرات! آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی متمدن دنیا جس کی رہنمائی روم و ایران کی مغربی و مشرقی شہنشاہیوں کے ہاتھ میں تھی، آج کی دنیا سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ انسان پورے طور پر خدا فراموش ہو گیا تھا۔ خدا کا اعتقاد ایک تاریخی نظریہ اور علم کر

[1] منقول از "نیچ"۔

[2] A Guide to Modern Wickedness

زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ لوگ صرف تاریخی طور پر یہ تسلیم کرتے تھے کہ اس عالم کو کسی زمانہ میں خدا نے پیدا کیا تھا، وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ. لیکن عملی زندگی کا کوئی ربط اس سے باقی نہیں رہا تھا، اور زندگی عملاً اس طرح گزر رہی تھی کہ گویا خدا نہیں ہے، یا ہے تو (معاذ اللہ) گوشہ نشین اور دوسروں کی خاطر سلطنت سے دست بردار ہو چکا ہے۔ ساری زمین پر اَرْبَاب مِنْ دُوْنِ اللہ کی عبادت و پرستش کا جال پھیلا ہوا تھا۔ کہیں بتوں کی پرستش تھی، کہیں قوم و نسل کی، کہیں ہوا و ہوس کی، کہیں طاقت و اقتدار کی، کہیں ملوک و سلاطین کی اور کہیں احبار و رہبان (عالموں اور عابدوں) کی۔ انسان اپنی زندگی کا مقصد اور زندگی کے صحیح مشاغل بھول کر تدریجی خودکشی اور غلط مشاغل میں منہمک تھا۔ ساری دنیا پر ایک عالم خود فراموشی طاری تھا۔ اہل حکومت ظلم و جور، جبر و استبداد، مردم آزاری، اور دولت ستانی میں مشغول تھے۔ امرا اپنے عیش و عشرت میں بدمست ہو رہے تھے۔ زندگی کا معیار اتنا بلند اور لوازم زندگی اتنے کثیر ہو گئے تھے کہ نئے نئے محاصل اور تاوانوں اور مظالم سے بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔ معاشرت کا معیار اور زندگی کا تخیل اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ جس شخص کے پاس امارت کے لوازم نہ ہوتے اس کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں اس کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ زندگی کی گرانی اور ہم چشموں میں با اعتبار اور با وقار بننے کی فکر میں ہر شخص ہمیشہ ایک فکر و غم اور کوفت میں مبتلا رہتا۔ متوسط طبقہ کے لوگوں کو اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی نقالی اور ریس سے فرصت نہ ملتی۔ غربا کو محکومی اور غلامی اور نئے نئے محاصل کے بوجھ سے سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی۔ وہ اپنے آقاؤں کے عیش و آرام اور ان کے جائز و ناجائز مطالبات کی تکمیل کے لیے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جُتے رہتے اور جب کبھی اس سے چھٹی ملتی تو زندگی کا غم غلط کرنے کے لیے ناجائز تفریحات اور بدمستیوں سے دل بہلاتے۔ پورے پورے ملک میں بعض اوقات ایک متنفس بھی ایسا نہ ہوتا جس کو اپنے دین اور آخرت کی فکر ہوتی اور موت کا خیال آتا۔ بے گناہ شہری، حکومتوں کے حرص و آز اور ملک گیری کی ہوس کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پستے رہتے۔ ایرانی سلطنت نے بغیر کسی معقول وجہ اور ضرورت کے شام کی عیسائی سلطنت پر فوج کشی کی اور لاکھوں ہزاروں بے گناہ انسانوں کے خون سے اللہ کی زمین رنگین کی۔ اس کے جواب میں رومی سلطنت نے ایرانی سلطنت کو زیر و زبر کر دیا اور پُرامن شہریوں کا انتقام پُرامن شہریوں سے لیا۔ بلا کسی بلند مقصد اور اخلاقی مہم کے اس خونیں جنگ کا سلسلہ برسوں جاری رہا اور دنیا کی دو متمدن سلطنتوں کے باشندے اور مہذب و متمدن ترین انسان وحشیوں کی طرح ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے۔ پورے کرۂ ارض پر اس وقت اندھیرا چھایا ہوا تھا اور انسانوں کی غلط کاریوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے ایک عالمگیر ابتری اور ہمہ گیر خرابی پھیلی ہوئی تھی۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الروم - ۱)

اس وقت اس متمدن دنیا سے (جس کو پورے طور پر گھن لگ چکا تھا) الگ لیکن اس سے بالکل قریب اور ان دونوں حریف مشرقی و مغربی شہنشاہیوں کے بیچ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں کے درمیان ایک اُمّی پیغمبر کو مبعوث فرمایا تاکہ دنیا کو اس عذاب سے نجات دے جس میں وہ صدیوں سے مبتلا تھی اور آخرت کے اس عذاب سے ڈرائے جو پیش آنے والا ہے، تاریکیوں سے نکال کر خدا کی روشنی میں لائے، بندوں کی بندگی سے نکال خدا کی بندگی میں داخل کرے اور وہ تمام زنجیریں اور بیڑیاں کاٹے جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں۔ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ (وہ نبی امی)، انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے اور پسندیدہ

لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔

چیزیں حلال کرتا ہے، گندی چیزیں حرام ٹھیراتا ہے، اُس بوجھ سے نجات دلاتا ہے جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں، ان پھندوں سے نکالتا ہے جن میں وہ گرفتار ہیں۔

اسی نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۶ ھ (سنہ ۶۳۰ء) میں رومی شہنشاہ (ہرقل) کو مدینہ سے ایک خط اور پیغام بھیجا جس میں دعوت تھی:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران - ۷)

اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں تم میں برابر ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔

ہرقل نے اس دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیا لیکن وہ اپنی کمزوری کی بنا پر اُس ربوبیت سے دست بردار نہ ہو سکا جس سے وہ متمتع ہو رہا تھا۔ اس طرح رومی زندگی کے اس عذاب سے اس وقت تک نجات حاصل نہ کر سکے جب تک کہ مسلمان مجاہدین نے شام و روم کے ممالک کو اپنے سایۂ رحمت میں نہیں لے لیا۔

لیکن عرب کی درماندہ قوم نے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول کر لیا اور وہ ساری نعمتیں حاصل کیں جو اس پیغام کا نتیجہ ہیں۔ ان کی غلامی کی تمام زنجیریں خود بخود کٹ گئیں، خدا کے آستانہ پر سر جھکا کر وہ دنیا کے تمام آستانوں سے بے نیاز ہو گئے، نہ نفس کی بندگی رہی، نہ بادشاہیوں اور حکومتوں کی غلامی، نہ جاہلانہ رسم و رواج اور معاشرت و سوسائٹی کی سابق ظالمانہ بندشیں، نہ اپنی لائی ہوئی اور نہ دوسروں کی ڈالی ہوئی مصیبتیں۔ خدا شناسی اور خدائی عظمت و کبریائی کے علم نے دنیائے مصنوعی خداؤں کی عظمت کا طلسم توڑ دیا اور ان کو ان کی نظر کر گرا دیا۔ عرب کے یہ فاقہ مست فریدہ پیرہن گلیم پوش اعرابی جو کبھی اپنے صحرا اور بادیہ سے باہر نہ نکلے تھے اور جنھوں نے شان و شوکت کا کوئی مظاہرہ نہیں دیکھا تھا، شاہان عجم سے اس طرح آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بے تکلف باتیں کرتے تھے اور ان کے درباری کر و فر کو اس بے پروائی اور تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے گویا مٹی کی مورتیں اور کاغذ کے کھلونے ہیں جن کو جھنڈیوں سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔ وہ ایسے حقیقت شناس ہو گئے تھے کہ شان و شوکت کے کھوکھلے مظاہر ان کو ذرا متاثر نہ کرتے اور کہیں وہ اپنے اصول اور اعلیٰ اخلاقی معیار سے ذرا بھی انحراف کرنا پسند نہ کرتے۔ وہ اپنے کو خدا کے بندوں کو دوبارہ خدا کی بندگی میں داخل کرنے اور انسانوں کی خدائی کا طلسم توڑنے پر مامور و مبعوث سمجھتے۔

حضرت سعد بن وقاص نے ایرانیوں کے سپہ سالار اعظم اور امیر رستم کی فرمائش پر ربعی بن عامر کو بطور سفیر کے بھیجا۔ ایرانیوں نے بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ دربار سجایا۔ زریں قالین، اور ریشمیں فرش بچھائے۔ یاقوت اور آبدار موتیوں کی چمک سے نظر نہیں ٹھیرتی تھی۔ رستم سر پر تاج زریں رکھے اور جسم پر زرنگار پوشاک پہنے سونے کے تخت پر جلوہ افروز تھا۔ ربعی اس شان سے دربار میں داخل ہوئے کہ جسم پر موٹے موٹے کپڑے، ہاتھ میں تلوار و سپر، اور رانوں کے نیچے کوتاہ قامت گھوڑا۔ وہ اسی شان بے نیازی کے ساتھ گھوڑے پر سوار فرش پر آگئے، گھوڑے سے اتر کر امراء دربار کے ایک گاؤ تکیہ سے گھوڑے کو باندھ دیا۔ زرہ پوش، ہتھیار بند مجلس میں آئے۔ چوبداروں نے عرض کیا ہتھیار رکھ دیجیے، کہا میں اپنے شوق سے نہیں آیا تمھارا بلایا ہوا آیا ہوں، اگر تمھیں اس طرح میرا آنا منظور نہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ رستم نے کہا آنے دو۔ ربعی قالینوں پر اپنے نیزے کو چھوتے ہوئے اور اس سے عصا کا کام لیتے ہوئے اس طرح بے تکلف

بڑھتے چلے گئے کہ قالین جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گئے۔ جاکر رستم کے پاس بیٹھے۔ رستم نے پوچھا کہ آپ کا اس ملک میں آ۔۔۔نے کا مقصد کیا ہے۔ انھوں نے کہا اللہ نے ہمکو اس کام کے لیے مقرر کیا ہے کہ ہم اس کے حکم سے اس کے بندوں کو بندوں کی بندگی کر نکال کر اللہ کی بندگی میں، دنیا کی تنگی سے نجات دے کر وسعت وکشادگی میں، مذاہب کے ظلم وجور سے بچا کر اسلام کے عدل وانصاف میں داخل کریں۔ اس نے ہم کو اپنی مخلوق کی طرف اپنے دین کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ ہم اس کو اس دین کی دعوت دیں۔ اگر وہ اس کو مان لے تو ہم بھی مان لیں اور واپس چلے جائیں۔ اور جس کو اس سے انکار ہو اس سے ہم ہمیشہ لڑتے رہیں یہاں تک کہ ہم کو اللہ کا انعام مل جائے۔ رستم نے کہا وہ انعام کیا ہے؟ کہا، جو اس راستہ میں مرجائے اس کے لیے جنت اور جو زندہ رہ جائے اس کے لیے اللہ کی نصرت۔ رستم نے کہا میں نے آپ کی بات سن لی، کیا آپ ہم کو اتنی مہلت دے سکتے ہیں کہ ہم ا۔کان سلطنت سے مشورہ کرلیں۔ کہا، ہاں، آپ کو کتنی مہلت چاہیے؟ ایک دن یا دو دن؟ کہا، اتنے تھوڑے وقت میں کیا ہوگا؟ ہمیں خط وکتابت کرنی پڑے گی اور رائے معلوم کرنی ہوگی۔ ربعی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے مقابلہ کے وقت تین دن سے زیادہ مہلت دینے کی نظیر نہیں چھوڑی، لہٰذا اس معاملہ پر جلد غور کر لیجیے، اور تین چیزوں (اسلام، جزیہ اور جنگ) میں سے کسی ایک چیز کو انتخاب کر لیجیے۔ رستم نے کہا، آپ مسلمانوں کے سردار ہیں؟ ربعی نے کہا، نہیں، مسلمان سب جسم واحد ہیں، ان میں سے سب سے ادنیٰ کو بھی سب سے اعلیٰ کے مقابلہ میں پناہ دینے کا حق ہے۔

ایک سفارت میں حضرت مغیرہ گئے۔ اس دن دربار کی نئی شان تھی۔ ایرانیوں نے اپنی شان وشوکت اور دولت وحشمت کا انتہائی مظاہرہ کیا تھا۔ مغیرہ بے تکلف صدر کی طرف بڑھتے ہوئے صدر مجلس (رستم) کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ ایرانیوں نے یہ منظر کہاں دیکھا تھا، تاب نہ لاسکے اور بازو پکڑ کر تخت سے اتار دیا۔ مغیرہ نے کہا، مہمان کے ساتھ تو یہ سلوک مناسب تھا۔ ہم لوگوں میں یہ دستور نہیں کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھ جائے اور تمام لوگ اس کے آگے بندوں کی طرح کھڑے ہوں۔ ان کی اس بے باکانہ گفتگو کا ترجمہ کیا گیا تو دربار پرستا نا چھا گیا اور لوگوں نے اعتراف کیا کہ ہماری غلطی تھی۔

ایک رومی دربار میں حضرت معاذ بن جبل سفیر بن کر گئے۔ دربار میں دیبائے زریں کا فرش بچھا تھا۔ معاذ زمین پر بیٹھ گئے اور کہا میں اس فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر بنایا گیا ہے، بیٹھنا نہیں چاہتا۔ عیسائیوں نے کہا ہم تو تمھاری عزت کرنا چاہتے تھے لیکن ہم کیا کریں، تم کو خود اپنی عزت کا خیال نہیں۔ معاذ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوگئے اور کہا جس کو تم عزت سمجھتے ہو مجھے اس کی پروا نہیں، اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا شیوہ ہے تو مجھ سے بڑھ کر کون خدا کا غلام ہو سکتا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ مسلمانوں میں تم سے بھی کوئی بڑھ کر ہے؟ معاذ نے کہا معاذ اللہ یہی بہت ہے کہ میں سب سے بدتر نہ ہوں۔ رومیوں نے اپنے بادشاہ پر فخر کیا۔ معاذ نے کہا کہ تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمھاری جان ومال کا اختیار ہے، لیکن ہم نے جس کو بادشاہ بنا رکھا ہے وہ اپنے آپ کو کسی بات میں ترجیح نہیں دے سکتا، اگر وہ زنا کرے تو اس کو درے لگائے جائیں، چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں، وہ پردہ میں نہیں بیٹھتا، اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا، مال ودولت میں اس کو ہم پر کوئی ترجیح نہیں۔

اس ذہنی وقلبی انقلاب کے صفت جو ایک خدا کو اپنا معبودِ حقیقی اور رب مان لینے سے پیش آیا، ان کی زندگی سراسر تبدیل ہوگئی۔ جو بہائم تھے وہ فرشتہ خصلت انسان بن گئے۔ جو غارت گر اور رہزن تھے وہ دوسروں کی جان ومال اور عزت وناموس کے محافظ بن گئے۔ جو جانوروں کے پہلے اور پیچھے پانی پینے پلانے پر خون کی ندیاں بہا دیتے تھے، دوسروں کی خاطر پیاسا مرجانا پسند کرنے لگے۔ جو اپنی

بچیوں کو اپنے ہاتھوں زمین میں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے وہ دوسروں کی بچیوں کی پرورش کے لیے اپنی گودیں خالی کرنے لگے۔ جو دوسروں کے مال کو اپنا مال سمجھتے تھے وہ اپنا مال بھی دوسروں کا مال سمجھنے لگے۔ جن کو دن کی روشنی میں لوگوں کا مال لوٹ لینے میں باک نہ تھا وہ ایسے امانت دار بنے کہ ان کا ایک شخص رات کی تاریکی میں خسرو ایران کا تاج زریں جو لاکھوں روپے کی مالیت کا تھا اپنے کمل میں چھپا کر امیر لشکر کے پاس پہنچا تا ہے۔

خدا طلبی نے دنیا طلبی اور زر طلبی کے اس بحران اور جوش کو سرد کر دیا جس نے دنیا کی عافیت تنگ کر دی تھی اور دنیا کو محض ایک بازار اور منڈی بنا دیا تھا۔ مسابقت کا وہ فطری جذبہ جو انسان کی دبی ہوئی قوتوں کو ابھارتا اور اس کے جوہروں کو چمکاتا ہے، جب تک دنیا کی طرف متوجہ رہا اس نے زندگی کو ایک غیر مختتم کشمکش بنا دیا تھا اور بھائی بھائی میں رقابت پیدا کر رکھی تھی۔ مگر جب اسی جذبہ کا رُخ دین کی طرف پھیر دیا گیا تو اس نے شریفانہ انسانی خصائل کو ابھار دیا اور سیرت کو پاکیزہ بنا دیا۔ مختلف انسانی طبقات اور ان طبقوں کے مختلف افراد میں اب بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش تھی مگر نیک کرداری، اجر و ثواب اور خدا کی مغفرت و رضا کے حصول میں۔ ایک دفعہ غربا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ ہمارے دولت مند بھائی ہم سے آگے بڑھے جا رہے ہیں، نماز روزہ وہ ہماری طرح کرتے ہیں اور صدقہ و خیرات میں ہم ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ آپ نے ان کو ایک ذکر بتا دیا۔ دولت مندوں نے سنا تو انھوں نے بھی وہ ذکر شروع کر دیا۔ غربا نے آکر پھر عرض کیا کہ ہم تو پھر پیچھے رہ گئے، ہمارے دولت مند بھائیوں نے بھی وہی ذکر شروع کر دیا ہے جو آپ نے ہم کو بتلایا تھا۔ آپ نے ان کو تسکین دی۔

زہد و قناعت نے دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیا جس میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کی جھلک نظر آتی تھی۔ مال کی طمع اور حرص و منافست کے دور ہو جانے سے قلوب میں ایسی اُلفت اور محبت پیدا ہو گئی تھی کہ نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ (ہم نے ان کے سینے کے کھوٹ کو نکال دیا)، کا منظر جو اہلِ جنت کی صفت ہے دنیا میں نظر آنے لگا۔ حقوق طلبی کے بجائے فرض شناسی اور طمع کے بجائے ایثار کا ایسا مادہ پیدا ہو گیا کہ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ کا نظارہ دیکھنے والوں کو نظر آیا، اور چشم فلک نے حیرت کے ساتھ یہ سماں دیکھا کہ میزبان نے اپنے بچوں کو بھوکا سلا کر اور چراغ بجھا کر مہمانوں کو یقین دلایا کہ ان کے ساتھ وہ کھانے میں شریک ہے۔ مہمان شکم سیر ہو کر اٹھے اور میزبان بیوی بچوں سمیت رات بھر بھوکا رہا۔

یہ ساری اصلاح اور یہ ساری ترقی نتیجہ تھی اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کر لینے، اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینے اور خود کو ایک معصوم پیغمبر کی نگرانی اور تربیت میں دیدینے کا۔ اس سے گویا ان کی زندگی کی چول ٹھیک بیٹھ گئی اور ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھیک آ گئی۔

حضرات! یہی دنیا نے اس پیغام کی قدر نہ کی۔ اس کا شرقی حصہ تو بہت جلد ان لوگوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا جو اس پیغام کے حامل اور اپنے پیغمبر کے جانشین تھے لیکن اس کا مغربی اور شمالی حصہ یورپ مجاہدینِ اسلام کے حلقے سے باہر رہا۔ اس نے پوری نو صدیاں یا ایک ہزار سال جہالت اور ظلمت کے اس دور میں گذارے جس کو وہ خود اپنی زبان سے تاریک کہتا ہے۔ انسانی تاریخ کا یہ طویل زمانہ جو وحشت و جہالت، عقل دشمنی اور اوہام پرستی، رہبانیت کی مردم آزاری اور آدم بیزاری، اپاپائے کلیسا کی آتشیں دار و گیر اور ظالمانہ احتساب کے نذر ہوا۔ اس کا افسوس یورپ کو ہمیشہ رہے گا اور اس کی ندامت سے اس کی گردن ہمیشہ جھک جانی چاہیے۔ یہ سب کرشمہ تھا اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ (انھوں نے اپنے عالموں، راہبوں اور حضرت مسیح کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنا لیا) کا۔ سولھویں صدی میں جب اس کی آنکھیں

کھلیں تو اس نے خیال کیا کہ اس کی ساری مصیبتوں کا علاج یہ ہے کہ وہ کلیسا کی غلامی سے نجات حاصل کرے۔ لیکن اس نے لا الٰہ کی پوری منزل طے نہیں کی۔ اُس نے لا کلیسا کو لا الٰہ کا مرادف سمجھا اور صرف کلیسا کی نفی کرنے کے بعد دوسرے الٰہ اپنے اوپر مسلط کر لیے۔ رہا اِلّا اللہ، تو اس کا تو اس نے آغاز ہی نہیں کیا۔ مغرب اپنی اہم ترین تاریخ کی ان تین صدیوں میں اپنے ایک ایک پسندیدہ اِلٰہ سے روٹھ کر دوسرے نئے نئے الٰہ تراشتا رہا اور اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ کا منظر نظر آتا رہا۔ آج بھی وہ اپنے بہت سے قدیم آلہہ سے بیزار نظر آتا ہے لیکن دوسرے آلہۂ باطلہ تراشتا جا رہا ہے۔ ان میں سے کسی اِلٰہ کا نام جمہوریت ہے، کسی کا نام آمریت (ڈکٹیٹرشپ)، کسی کا نام سرمایہ داری، کسی کا نام اشتراکیت، کسی کا نام قومی اشتراکیت، کسی کا نام قوم اور کسی کا نام وطن۔ مغرب اپنی زندگی کے نقشے اُدھیڑ اُدھیڑ کر بناتا اور اپنی زندگی کی گھڑی کے پرزے بکھیر بکھیر کر جماتا ہے لیکن اس کی چول نہیں بیٹھتی۔ اس اُلجھی ہوئی ڈور کو وہ برسوں سے اپنے ناخنِ تدبیر سے سُلجھا رہا ہے لیکن جس قدر سُلجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ اُلجھتی جا رہی ہے یہاں تک کہ اب اس میں خود اس کی انگلیاں اس طرح پھنس گئی ہیں کہ نکلتی نہیں۔

وہ زندگی کے ہزار نقشے بنائے اور ان میں ہزار ترمیمیں کرے اور ان کے نئے نئے نام رکھے، ایک شخص کی ذمہ داری بہت سے اشخاص پر منقسم کرے یا بہت سے اشخاص کی ذمہ داری ایک منتخب ترین اور ذمہ دار ترین پر ڈال دے اور اس شخص کو صدہا قیود و ضوابط سے جکڑ دے، لیکن جب تک اس جسم کا قالب نہیں بدلتا، وہ ذمہ دار ایک فرد ہو یا کوئی جماعت یا پوری قوم جب تک اپنے آپ کو ایک بالاتر طاقت علیم و خبیر کے سامنے ذمہ دار نہیں سمجھتی جب تک اس کے دل میں خوف خدا اور آخرت کی باز پرس کا کھٹکا نہیں، خیر کا رجحان اور نیکی و امانت کا شعور نہیں، اس وقت تک محض ناموں کی تبدیلی سے اور قوانین و ضوابط سے حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

حضرات! سیرتِ محمدی کا اصل پیغام اس بیسویں صدی کی دنیا کے نام جس کی قیادت آج مغرب کے ہاتھ میں ہے، یہ ہے کہ اے اللہ سے بھاگنے والو اللہ کی طرف بھاگو اور اس کے سوا کسی کو الٰہ نہ بناؤ:

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (الذاریٰت۔۳)

پس بھاگو اللہ کی طرف۔ بے شک میں تمھارے لیے اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ بے شک میں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

یہ پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہر آن دنیا کو سناتی ہے اور دنیا کے گوشہ گوشہ تک یہ دعوت پہنچاتی ہے۔ ہوا اپنے کاندھوں پر اور سمندر اپنے سر آنکھوں پر رکھ کر اس پیغام اور دعوت کو دنیا کے ملکوں اور قوموں کو پہنچا رہے ہیں اور دنیا کا یہ شور جو کچھ سننے نہیں دیتا اگر ذرا کم ہو تو اب بھی کان میں وہی آواز آ رہی ہے جس کو پہلی صدی کے اہلِ کتاب نے سنا تھا۔

قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (مائدہ۔)

تمھارے پاس ایک روشنی اور ایک کھلی ہوئی کتاب آ گئی ہے جس کے ذریعے سے اللہ ہر اس شخص کو جو اس کی رضا کا پیرو ہو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

پیغمبر ہی انسانی جہاز کے ناخدا ہیں۔ انسانوں کی کشتی ہر زمانہ میں انھیں کی ناخدائی سے ساحل تک پہنچی ہے۔ یہ صرف حضرت

نوح کے فرزندی کی خصوصیت نہ تھی، ہر زمانہ میں جس نے بھی یہ دعویٰ کیا کہ سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ (میں تو پہاڑ پر پناہ لے کر طوفان سے محفوظ رہ جاؤں گا) اس کو یہی جواب ملا لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (آج کوئی بچانے والا نہیں)۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد افراد اور قوموں، اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب، اولین و آخرین سب کے لیے اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ سعادت و فلاح انھیں کے دامن سے وابستہ ہے۔ ان سے علیحدہ ہو کر شقاوت و ہلاکت، محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں۔

محمد عربی کا آبروے ہر دو سراست   کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سرِ او

حضرات! اس پیغام کا ایک حصہ مسلمانوں کے نام بھی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی دنیا کچھ ویران اور کوئی قبرستان نہ تھی۔ زندگی کا چکر جس طرح اس وقت چل رہا ہے بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُس وقت بھی چل رہا تھا۔ سارے کاروبار آج کی طرح ہو رہے تھے۔ تجارت بھی تھی، زراعت بھی تھی اور حکومتوں کا نظام چلانے والے اور ان کی مشنری میں فٹ ہونے والے بھی موجود تھے۔ اس وقت کی دنیا کے لوگ اس زندگی پر بالکل قانع اور مطمئن تھے، اور ان کو اس میں کسی ترمیم یا اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین کا یہ نقشہ اور دنیا کی یہ حالت بالکل پسند نہ تھی۔ حدیث میں اس زمانہ کے متعلق ہے: ان اللہ نظر الی اھل الارض فمقتھم عربھم وعجمھم الا بقایا من اھل الکتاب (اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین پر نظر ڈالی، اس نے روئے زمین کے تمام باشندوں، کیا عرب اور کیا عجم سب کو بے حد ناپسند فرمایا اور وہ ان سے بیزار ہوا سوائے اہلِ کتاب میں سے چند افراد کے) ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ساتھ ایک پوری اُمت کے ظہور کا سامان کیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ نے ان کو کسی ایسے مقصد کے لیے پیدا کیا جو دوسری قوموں سے پورا نہیں ہو رہا تھا۔ جو کام وہ سب پورے انہماک اور شوق کے ساتھ انجام دے رہے تھے، اسی کام کے لیے تو ظاہر ہے کہ کسی نئی امت کو پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی اور نہ انسانی زندگی کے سمندر میں اس نئے تلاطم کی کوئی حاجت تھی جو مسلمانوں کے وجود سے ظہور میں آیا اور جس نے زمین میں ایک زلزلہ ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ تسبیح اور تقدیس کے لیے ہم نیازمند بہت کافی تھے، اس کے لیے اس خاکی پتلے کو پیدا کرنے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، گویا اشارہ فرمایا (اور آگے چل کر واضح کر دیا) کہ آدم صرف اسی کام کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔ صاحبو! اگر مسلمان صرف تجارت کے لیے پیدا کیے جا رہے تھے تو مکہ کے ان تاجروں کو جو شام و یمن کا تجارتی سفر کیا کرتے تھے اور مدینہ کے ان بڑے بڑے یہودی سوداگروں کو جن کے بڑے بڑے گرہ بنے ہوئے تھے یہ پوچھنے کا حق تھا کہ اس خدمت کے لیے ہم گناہ گار کیا کم ہیں کہ اس کے لیے ایک نئی امت پیدا کی جا رہی ہے۔ اگر زراعت مقصود تھی تو مدینہ اور خیبر کے، طائف اور نجد کے، شام و یمن اور عراق کے کاشتکاروں اور زراعت پیشہ آبادی کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ کاشتکاری اور زراعت میں ہم محنت و کوشش کا کونسا دقیقہ اٹھا رکھتے ہیں کہ جس کے لیے ایک نئی امت کی بعثت ہو رہی ہے۔ اگر دنیا کی چلتی ہوئی مشنری میں صرف فٹ ہونا تھا اور حکومتوں کے نظم و نسق اور دفتری کاروبار کو اجرت لے کر چلانا تھا تو روم و ایران کے کارپردازانِ حکومت کو یہ کہنے کا حق تھا کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے ہم بہت ہیں، اور ہمارے بہت سے بھائی بیروزگار ہیں، اس کے لیے نئے امیدوار کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن درحقیقت مسلمان بالکل ہی ایک نئے اور ایسے کام کے لیے پیدا کیے جا رہے تھے جو دنیا میں کوئی نہ انجام دے رہا تھا اور نہ دے سکتا تھا۔ اس کے لیے ایک نئی امت ہی کی بعثت کی ضرورت تھی، چنانچہ فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ (آل عمران : ۱۰)

تم بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

اسی مقصد کی خاطر لوگ وطن سے بے وطن ہوئے، اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا، اپنا عمر بھر کا اندوختہ لٹایا، اپنی جمی جمائی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا، اپنے عیش و تنعم کو خیرباد کہا، دنیا کی تمام کامیابیوں اور خوش حالیوں کو آنکھیں بند کرلیں اور ان کے سامنے آئی ہوئی فرصتیں ضائع کیں، پانی کی طرح اپنا خون بہایا اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اُن مقاصد و مشاغل کے لیے جن پر آج مسلمان قانع نظر آتے ہیں اس ہنگامہ آرائی اور اس محشر خیزی کی ضرورت نہ تھی، اُن کے حصول کا راستہ بالکل بے خطر اور ہموار تھا اور اس راستہ پر معاصر دنیا سے کوئی بڑی کشمکش اور تصادم نہیں تھا۔ اور نہ یہ اہل عرب اور دنیا کی دوسری قوموں کے لیے وجہ شکایت تھی۔ انھوں نے تو بار بار انھیں چیزوں کی پیش کش کی جو آج عام مسلمانوں کا منتہا ہے اور ہر بار اسلام کے داعی نے اس کو ٹھکرایا۔ دولت و سرداری، عیش و عشرت اور راحت و تن آسانی کی بڑی سے بڑی پیش کش کو نامنظور کیا۔ پھر اگر مسلمانوں کو اسی سطح پر آجانا تھا جس پر زمانہ بعثت کی تمام کا قومیں تھیں اور اس وقت بھی دنیا کی تمام غیر مسلم آبادی ہے، اور زندگی کے انھیں مشاغل میں منہمک و سراپا غرق ہوجانا تھا جس میں اہل عرب اور رومی و ایرانی ڈوبے ہوئے تھے، اور انھیں کامیابیوں کو اپنا منتہائے زندگی بنا لینا تھا جن کو ان کا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے بہترین موقع پر رد کرچکا تھا، تو یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر پانی پھیر دینے کے مرادف ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ انسانوں کا وہ بیش قیمت خون جو بدر، احد، حنین، احزاب، قادسیہ اور یرموک میں بہایا گیا بے ضرورت بہایا گیا۔

آج اگر سرداران قریش کو کچھ بولنے کی طاقت ہو تو مسلمانوں کو خطاب کرکے وہ کہہ سکتے ہیں کہ تم جن چیزوں کے پیچھے سرگرداں ہو اور جن چیزوں کو تم نے اپنا حاصل زندگی سمجھ رکھا ہے انھیں چیزوں کو تو ہم گنہگاروں نے تمھارے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سامنے پیش کیا تھا اور وہ تمام چیزیں اُس وقت خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل ہو سکتی تھیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا مقصود ہی نہ تھا، اُنھوں نے ادنیٰ توقف کے بغیر ان کو رد کردیا۔ ہم بے شک کشتنی و گردن زدنی تھے، لیکن مقصد کو نقصان پہنچانے کے لحاظ سے تم بھی بے گناہ نہیں ہو۔

حضرات! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے متعلق یہی خطرہ تھا کہ وہ دنیا میں پڑ کر اپنا اصل مقصد نہ بھول جائیں اور دنیا کی عام سطح پر نہ آجائیں۔ آپ نے وفات کے قریب جو تقریر فرمائی اس میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا:

ما الفقر اخشى عليكم ولكنى اخشى ان تبسط عليكم الدنيا كما بسطت على من كان قبلكم فتنافسوها كما تنافسوها فتهلككم كما اهلكتهم (بخاری۔ مسلم)

مجھے تمھارے بارے میں کچھ فقر و افلاس کا خطرہ نہیں ہے مجھے تو اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں تم کو بھی ویسی ہی کشائش نہ حاصل ہوجائے جیسی تم سے پہلے لوگوں کو حاصل تھی، پھر تم بھی اس میں اسی طرح حرص و مقابلہ شروع کردو جیسے انھوں نے کیا، پھر تم کو یہ دنیا اسی طرح ہلاک کردے جیسے ان کو ہلاک کیا۔

مدینہ کے انصار نے جب اس بات کا ارادہ کیا کہ جہاد کی مشغولیت اور اسلام کی جدوجہد سے کچھ دنوں کی فرصت حاصل

کرکے اپنے باغات، کھیتوں، اور کاروبار کو درست کرلیں اور کچھ مدت کے لیے صرف اپنے کاروبار میں مشغول ہونے کی اجازت حاصل کرلیں تو یہ خطرہ بھی ان کے دل میں نہ گذر سکتا تھا کہ وہ ارکان دین، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے بھی کچھ دنوں کے لیے اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرالیں، لیکن اسلام کی عملی جدوجہد اور دین کے فروغ اور اس کے غلبہ کی کوشش سے ان کی اس عارضی یکسوئی کو بھی خودکشی کا مرادف قرار دیا گیا۔ چنانچہ اسی پر سورہ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○

اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو، اور اچھی طرح کام کرو، بے شک اللہ اچھے کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاری نے اس آیت کی یہی شان نزول بیان کی ہے۔

مسلمان کی زندگی کی اصلی اسلامی ساخت یہی ہے کہ یا تو اسلام کی عملی جدوجہد میں مشغول ہو یا عملی جدوجہد میں مشغول ہونے والوں کے لیے پشت پناہ و مددگار ہو اور اس کے ساتھ عملی جدوجہد میں حصہ لینے کا عزم اور شوق بھی رکھتا ہو۔ مطمئن شہری اور محض کاروباری زندگی اسلامی زندگی نہیں ہے اور کسی طرح بھی یہ ایک مسلمان کا مقصود حیات نہیں بن سکتی۔ جائز مشاغل زندگی، جائز وسائل معیشت ہرگز ممنوع نہیں، بلکہ نیت اجر طلبی کے ساتھ عبادت و قربت الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ مگر جب کہ یہ سب دین کے سایہ میں ہوں اور صحیح مقصد کا وسیلہ ہوں، نہ کہ خود مقصود بالذات۔

حضرات! سیرت محمدی کا یہ سب سے بڑا پیغام ہے جو خالص مسلمانوں کے نام ہے۔ اس کی طرف توجہ نہ کرنا اور اس کے مقصد کو ضائع کرنا اس سب سے بڑی حقیقت کی طرف سے چشم پوشی ہے جو سیرت محمدی مسلمانوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

حقیقت نفاق

(از مولانا صدرالدین اصلاحی)

یہ مضامین پہلے ترجمان القرآن میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نفاق کی حقیقت، منافقین کی اقسام، علامات نفاق اور منافقین کے بارے میں شریعت کے احکام کو بہت وسعت اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

ضخامت ۱۴۰ صفحات۔ قیمت ۸/

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جماعت اسلامی۔ دارالاسلام پٹھان کوٹ